میر تقی میر کی شاعری کا تہذیبی منظر نامہ

ڈاکٹر محمد اعجاز تبسم

Dr. Muhammad Ijaz Tabassam

Assistant Professor, Department of Urdu,

Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

Kalam Mir is in fact a cultural marquee of the Mir era in which many colors of the historical and social life of the subcontinent are seen. He has the ability to present life-affirming attitudes and life-affirming moments in a fiery, sympathetic, and disturbing shawl. He mourned the loss of his life for the rest of his life. He was saddened by his relatives, his grief and grief kept him short for the rest of his life, but he wisely warmed the wounds of his personal pain and time in his burning liver and gave him Urdu poetry. His sad eyes were constantly searching for a way out of his heart. Attitudes of social life, all the secrets of love and mysticism, different angles of poverty and dervishes, unique colors of trust and renunciation, many suns of pain falling in the molds of love and hate. There are tunnels on the threshold of compulsion, the monster of hunger and poverty, the growing shadow of sorrows, the Taj Mahal adorned with the natural colors of life, the sufferings, the narrow gorges of time, the imprints of morality, the signs of selfishness and longing., Songs of a lost and troubled life, comfort and relaxation, betrayals of beloved, parrot eyes of loved ones, lust for nature, defeat, and failure of life, despair, and disappointment, sorrow and depression,pleasures of migration and death, absorption The most beautiful cultural landscape of Mir Taqi Mir's poetry is compiled from heartfelt themes such as comforts immersed in Kiev, religious values and social

traditions, pleasures and many lost pages of Islamic civilization and history. This article will cover the above topics.

عہدِ میر اپنی تمام تر رعنائیوں، معاشرتی معیار و مسائل اور تہذیبی ناہمواریوں کو بطریق احسن پیش کرتا ہے۔ یہ اپنے اسلامی تہذیبی مزاج کی بدولت نہ صرف آفاقیت کا حامل ہے بلکہ اُردو شاعری کی تاریخ میں موضوعاتی اور معیاراتی سطح پر اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس میں میر تقی میر ''خدائے سخن'' اور ''شہنشاہِ غزل'' قرار پائے۔ قصیدہ میں مرزا محمد رفیع سودا کو باوا آدم کا درجہ ملا۔ ''سحر البیان'' کے خالق میر حسن جیسے نامی گرامی شعرا اور دیگر سخنوروں نے اسے کمال ترقی عطا کی۔ جن میں میر اثر، میر محمدی بیدار، غلام حسین ضاحک، جعفر علی حسرت، میر سوز، تاباں، رند، محسن، وفا، محمد حسین کلیم، اشرف علی فغاں، محمد باقر حزیں اہمیت کے حامل ہیں انھوں نے اپنے خاص تنقیدی شعور کی بدولت زمینی حقائق پر مبنی موضوعات کو اُردو غزل کا حصہ بنایا۔ بلکہ معاشرتی، مذہبی، تہذیبی اور سیاسی سطح پر بھی اسے وسعت عطا کی جو اسے اس سے پیشتر نصیب نہ ہو سکی تھی۔ یہی وہ عہد ہے جب اُردو شاعری جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے قابل ہوئی۔ اسی لاجواب عہد میں تمام اصنافِ سخن نے منتہائے کمال کو چھو لیا۔ اس سے پہلے اور بعد کے تمام ادوار کو اس لاثانی عہد سے ہمسری کرنے کا درجہ کبھی نصیب نہ ہو سکا۔ رام بابو سکسینہ نے اس کی معراج ترقی اور صاحب کمال شعرا کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ؤ ہے:

> ''یہ دور اُردو شاعری کی ترقی کا سب سے بڑا دور ہے اس میں شاعری کو معراج ترقی حاصل ہوئی۔ اسی میں میر حسن، درد، سودا اور میر ایسے صاحبِ کمال پیدا ہوئے جن کے نام اس وقت تک روشن ہیں بلکہ جب تک زبان اُردو دنیا میں رہے گی وہ کبھی مٹ نہیں سکتے۔''(۱)

اُردو شاعری کا یہ زریں عہد اپنے تہذیبی اور سماجی حالات کی آہ و بقا کا آئینہ دار اور تہذیبی و ثقافتی اقدار کا امین نظر آتا ہے۔ ہند اسلامی تہذیب کی آمیزش نے اسے چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس میں ہندستانی و ایرانی اور عربی تہذیب کے عناصر کا ربط ضبط جب الفاظ کے پیکر میں ڈھلتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کرب و بلا کے غموں کا تاج محل ہندستانی سر زمین پر سجا اپنی داستانِ الم بیان کر رہا ہے۔

نہ اک یعقوب رویا اس الم میں کنواں اندھا ہوا یوسف کے غم میں(۲)

میر نے اسلامی تہذیب و سماج، مذہبی عقاید، تہذیبی رویوں اور اخلاقی اقدار کو اپنے کلام میں پیش کر کے اپنے عہد اور آنے والے غزل گو شعرا کے لیے اک باوقار رستے کا تعین کر دیا۔ وہ بجا طور پر امام المتغز لین اور سرتاج شعرائے اُردو کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کے کلام میں ان القابات کی بھرپور تائید اور پاسداری ملتی ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ داد و دہش کا استحقاق رکھتے تھے۔

کلامِ میر دراصل عہدِ میر کا ایک ایسا تہذیبی مرقع ہے جس میں برِّصغیر کی تاریخی و سماجی زندگی کے کئی رنگ جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی آمیز رویوں اور زندگی آموز لمحات کو سوز و گداز، دردمندی اور سرگشتہ و پریشان شالِ مروت میں ملفوف کر کے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے زمانے کے کرب کو اپنے رنج و الم میں سمو کر خود کو عمر بھر اشک بار رکھا اور دوسروں کو بھی اشک بار کیا۔ انھیں اقربا سے دُکھ ملے، غمِ بتاں اور غمِ دوراں نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کیے رکھا لیکن انھوں نے ذاتی رنج و الم اور زمانے سے ملے زخموں کو کمال دانش مندی سے اپنے سوزِ جگر میں تپا کر اُردو شاعری کو رعنائی بخشی۔ ان کی خشمگیں چشم پُرنم ہر

دم دل گداز راہیں تلاش کرتی رہی۔ سماجی زندگی کے رویے، عشق و تصوف کے سربستہ راز، فقر و درویشی کے مختلف گوشے، توکل و استغنا کے منفرد رنگ، محبت و نفرت کے سانچوں میں ڈھلتے کئی آفتابِ درد، محبوب کی دہلیز پر سرنگوں ہوتی آہیں، بھوک اور افلاس کے عفریت، غموں کے بڑھتے سائے، زندگی کے فطری رنگوں سے سجا تاج محل، مصائب و آلام زمانہ کی تنگ گھاٹیاں، اخلاق و مروت کے نقوش، خود غرضی و جاہت کے نشاں، گم گشتہ و پریشان حال زیست کے نغمے، آسودگی و فراغت، محبوب کی بے وفائیاں، اپنوں کی طوطا چشمیاں، فطرت سے رغبت، شکست خوردگی و ناکامیِ حیات، نا اُمیدی و مایوسی، غم و افسردگی، جذب و کیف میں ڈوبی راحتیں، مذہبی اقدار اور سماجی روایات، رندی و سرمستی اور اسلامی تہذیب و تاریخ کے کئی گم گشتہ اوراق جیسے دل گداز موضوعات سے میر تقی میر کی شاعری کا حسین ترین تہذیبی منظر نامہ مرتب ہوتا ہے۔

جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا(۳)

کیا ذکر ہم صفیراں، یارانِ شادماں کا یا روے یار رُلایا، اپنی تو یوں ہی گزری(۴)

میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا داغِ فراق و حسرتِ وصل، آرزوئے شوق(۵)

یوں محسوس ہوتا ہے برصغیر کی تہذیبی روح ان کے جسدِ خاکی میں آ کر سما گئی ہے جس کے کئی رنگ ان کی شاعری میں بکھرے پڑے ہیں۔ وہ ہجر و وصال کی لذتیں ہوں یا سماجی زندگی کے مختلف نقوش، اجڑی ہوئی بستیاں ہوں یا ویرانے وہ دل کو چاک، جگر کو زخمی اور آنکھوں کو خونبار رکھتے ہیں۔ میر کا یہی تہذیبی لب و لہجہ انھیں حافظ و سعدی کے ہم پلہ ثابت کرتا ہے:

> ''میر کی غزل میں برعظیم کی تہذیبی روح اسی طرح آج تک چہک رہی ہے جس طرح حافظ کی غزل میں فارسی تہذیب بول رہی ہے۔''(۶)

وہ اس زوال آمادہ تہذیب میں عمارتِ دلِ درویش کی بنیاد رکھ کر معرفتِ حق کی خاطر زخموں پر زخم جھیلتے اور داغوں پہ داغ کھاتے رہے۔ ان کے ہاں کائنات کی بے ثباتی اور عشق کی معنویت کا تذکرہ بڑی شد و مد کے ساتھ ہوا ہے۔

جس نے جہاں میں آ کر کچھ اعتبار پایا کیا اعتبار یاں کا، پھر اس کو خوار دیکھا(۷)

دل کو چاک جگر کو زخمی آنکھوں کو خونبار رکھا عشق بھی ہم میں ہائے تصرف کیسے کیسے کرتا ہے(۸)

نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں(۹)

میر کی شاعری اسلامی تہذیب کے مذہبی و تاریخی رنگوں کے امتزاج سے اپنے عہد کے حالات و واقعات، سماجی صورت حال اور تہذیبی سانحات نہایت عمدگی سے پیش کرتی ہے۔ ان کے ہاں یہ درد و سوز، غم انگیز دھیمہ لب و لہجہ محض محاورہ بندی، تراکیب و تشبیہات اور نئے شعری تلازمات کے ذریعے پیدا نہیں ہوا بلکہ اس میں ماتم کناں حیات میر کے تمام ذاتی و کائناتی دُکھ چھپے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے داخلی رنگ کی بدولت ساری کائنات کے غموں کو اپنے اندر جذب کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ میر کے ہاں محبوب کی وعدہ خلافی بے وفائی اور ستم ظریفی ہو یا اس کے روئے مخطط کی تعریف و توصیف، وصال یار کا المیہ ہو یا عشق کی وجدانی کیفیات وہ اسلامی تاریخ سے ماخوذ کئی معتبر کرداروں، قرآنی تلمیحات اور مشاہیرِ عالم کے طرزِ حیات سے اپنی فکر و

دانش کو مہمیز لگاتے ہیں۔مثال کے طور پر معمرِ نوح سا، صابر ایوب سا، آتش کہے موسا، خضر کا آب کہنا، عشق ہے لا الٰہ الا اللہ، فسانۂ اصحاب فیل، یوسف ثانی، مصحف مجید، جبریل کا کتاب لانا، مثلِ آدم رویے، یعقوب کا کلبۂ احزاں، کاروانِ مصر اور کنعاں وغیرہ۔ یہ محض لفظیات کی ترتیب و تنظیم کا نام نہیں بلکہ اس میں ایک زندہ جاوید تہذیب کا عہدِ ماضی اپنی کرنیں بکھیر رہا ہے۔لہٰذا وہ الفاظ کو فکری و معنیاتی سطح پر لا کر ان کا معیار قائم کرتے ہیں۔اور اپنے لہجے کے زیر و بم سے کلام میں تہذیبی رعنائی پیدا کر کے اسے پُرکشش بنا دیتے ہیں۔

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم　　یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا(۱۰)

یعقوبؑ کے نہ کلبۂ احزاں تلک گئے　　سو کاروانِ مصر سے کنعاں تلک گئے(۱۱)

اس کے وعدے کی وفا تک وہ کوئی ہووے گا　　ہو معمر نوح سا صابر ہو پھر ایوب سا(۱۲)

آتے نہیں نظر میں مرے ہاتھی کے سوار　　کانوں میں جو فسانۂ اصحاب فیل ہے(۱۳)

کلامِ میر کی حزنیہ لے محبت کے فطری رنگوں سے مزین ایک انمول خزینے کی مانند ہے۔ وہ فارسی ادب سے ایسے جواہر ریزے و گوہرِ نایاب تراش لائے ہیں جن کے جذب و کیف سے اُردو شاعری کا دامن وسعتوں سے ہم کنار ہوا۔انھوں نے اس کی نوک پلک سنوار کر اسے مزید اعتبار بخشا اور اسے اُردو شاعری کے تشکیلی دور میں ترقی سے ہم کنار کیا۔ان کی تخلیقات شعری اُردو زبان و ادب کی آبرو بڑھانے میں کار آمد ثابت ہوئیں۔

میر تقی میر نے اپنے عہد کی زبوں حالی، پراگندہ صورت حال، پراگندہ ماحول، سماجی رویوں اور تہذیبی آدرشوں کو اپنے خونِ جگر میں سمو کر اُردو شاعری کی آواز بنا دیا۔اس آواز نے بلاتفریق مذہب و ملت اپنے دور کے تہذیبی و سماجی مسائل، تہذیبی ناہمواریوں، داخلی و خارجی معاملاتِ زندگی کو پیش کرنے میں کسی دروغ گوئی سے کام نہیں لیا۔درحقیقت:

> ’’میر کی آواز اٹھارھویں صدی کے برعظیم کی روح کی آواز ہے جس میں اس دور کے احساسات، امید و بیم، خوف و رجا، آس و یاس اور غم و الم شامل ہیں۔میر کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم اس دور کی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔‘‘(۱۴)

وہ پرانے اور نئے علائم و رموز، لفظیات، تراکیب و محاورات اور جذب و کیف سے جہاں ہجر و وصالِ محبوب کی لذتیں بیان کرتے ہیں وہاں مصائب و آلامِ زمانہ کی تنگ دامانیاں بھی ان کی شاعری کا موضوع بنتی ہیں۔انھوں نے اپنے المیاتی تاثر کو تادمِ آخر قائم رکھا۔میر زندگی کے نوحہ خواں بھی ہیں اور اپنے عہد کی تہذیبی و سماجی تاریخ کے راز داں بھی۔

میر کی غزل تاریخی حقائق کی ترجمان ہے اور اپنے عہدِ اسلامی کی سماجی تنزلی کو بخوبی واضح کرتی دکھائی دیتی ہے۔چوں کہ میر کا عہد سیاسی کمزوری اور اندرونی خلفشار کی بنا پر مسلسل اضطراب کا عہد تھا۔انھوں نے اپنے زمانے کا نوحہ خارجی و داخلی امتزاج کے ذریعے مہارت سے پیش کیا ہے۔وہ بچشمِ نم حالاتِ زمانہ کو دلی واردات کے ذریعے پیش کرتے رہے۔لکھنوی شعرا کے برعکس میر اپنی داخلی واردات پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید کے بقول: ’’میر کی شاعری ان کی داخلی واردات اور اس پریشان حال دور کی سماجی صورت کا آئینہ ہے۔ وہ زمانے کو بچشمِ نم دیکھا گئے اور دل کی زبان سے حالاتِ زمانہ رقم کرتے

گئے۔‘‘(۱۵)

بے باکی اور صاف گوئی، روزمرہ اور محاورات کی صفائی، مترنم بحروں کا استعمال، برمحل فارسی تراکیب، دلکش اور رواں بحریں اور سادگی وسلاست ان کی شاعری کے اوصاف ہیں۔ انھوں نے آلام ومصائب زمانہ کے تلخ تجربات کو جس سوز وگداز اور تاثیر سے اپنی فکریات کا حصہ بنایا ہے وہ اہم ہے۔

ہر طرف ظلم ہو رہا ہے یہاں اک سسکتا ہے ایک مرتا ہے(۱۶)

ــــــــ

مل گئے خاک میں یہاں صاحبِ افسر کتنے تو ہے بے چارہ گدا میر ترا کیا مذکور(۱۷)

وہ انسانی حُسن کے فطری تقاضوں کے جوہرشناس تھے۔ ان کے کشکول میں قافلۂ غم اور جنسی جذبے کی تقدیس کا رنگ نہایت رچا اور سنورا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس ہنگامۂ رستخیز کے فرد تھے جس میں اہلِ کمال مفلسی وکسمپرسی کے ہاتھوں پس رہے تھے مگر انھوں نے عشق اور تصوّف کی تاثیر سے معرفتِ ذات سے معرفتِ حق کا رستہ اختیار کیا۔ لہٰذا تزکیۂ قلب اور صفاۓ باطن ان کے لیے دوامرت دھارے ثابت ہوئے جنھوں نے انھیں انسانیت کی معراج پر پہنچا دیا۔ وہ انسانیت نواز اُصولوں پر تمام زندگی کاربند رہے۔ محمد طفیل عشق اور تصوف کو ان کی زندگی کے دو بنیادی محرکات قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’عشق اور تصوف یہ دو بنیادی محرک ہیں جنھوں نے میر صاحب کی سیرت کو انسانیت کے اعلیٰ معیار تک پہنچانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا اور اس اعلیٰ سیرت نے اس فن کی تخلیق کی جو دنیا کے ادبِ عالیہ میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔‘‘(۱۸)

یہ مقام بڑی محنت اور ریاضت کا متقاضی تھا انھوں نے اسے پانے کے لیے ساری زندگی تگ ودو کی۔ اس تگ ودو نے انھیں آفاقی شاعر کا روپ عطا کر دیا۔ وہ ’’شہنشاہِ غزل‘‘، ’’خدائے سخن‘‘، ’’سرتاج شعرائے اُردو‘‘، ’’ملک الشعرا‘‘ اور امام المتغزلین کے درجے پر آج بھی فائز نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی صوفیائی تربیت، گہری فہم وفراست، جذبۂ غم، ادراکِ غم وبصیرتِ عشق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے جذبۂ محبت کی دلسوزی اور دردمندی کو لامحدود زندگی کے وسیع تر تہذیبی حربوں کی صورت میں استعمال کیا:

خضر آب اسے کہتا ہے آتش کہے موسا تحقیق کروں کس سے حقیقت کے نشے کو(۱۹)

ــــــــ

حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق(۲۰)

ہم نہ سمجھے بڑا تاسّف ہے دل عجب نسخۂ تصوف ہے(۲۱)

میر نے اپنی غزل کو بےفکری مدام آلائم وافکارِ روزگار اور عشق جیسے مقدم جذبے سے مزین کیا ہے۔ عشق میر کے یہاں مقامِ ابدیت کا استعارہ اور ایک ایسا روحانی مقام ہے جو کسی کسی کا مقدر بنتا ہے:

کیا کہوں تم سے میں کہ کیا ہے عشق جان کا روگ ہے بلا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق عشق عاشق ہے یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
عشق ہے طرز و طور عشق کے تیئں کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق(۲۲)

میر کی غزل میں عشق کا خالصتاً اسلامی تہذیبی تصور اُبھرتا ہے۔انھوں نے اسے لامحدود قوت اور لامتناہی جذبے کے طور پر اپنی فکریات کا حصہ بنایا۔وہ اپنی قدرتِ خداداد اور غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر نہ صرف آفاقی درجے کے حامل شاعر قرار پائے بلکہ ان کی شاعری کو محبت کی پاکیزگی اور آفاقی رنگ کی عملی تفسیر قرار دیا جاسکتا ہے۔جس طرح انھوں نے محبت کے تقدس کو مجاز سے حقیقی رنگ میں سمونے کا بے لوث مظاہرہ کیا اور اس کی لامحدود طاقت کو تسلیم کیا۔عشق کی مادی کثافتوں کو روحانیت کے لبادے میں اوڑھ کر پیش کرنے کا وہ بے پناہ سلیقہ رکھتے ہیں:

''میر کی شاعری محبت کے تقدس اور آفاقیت کی تفسیر ہے۔وہ محبت کے عام ترین تجربات کو اس کی خاص ترین کیفیات اور عشق کی مادی کثافتوں کو روحانی لطافتوں میں سمودینے کا حیرت انگیز ملکہ رکھتے ہیں جو کسی دوسرے کے یہاں اس حد تک ممکن نہیں۔'' (۲۳)

یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد اور بعد کے ادوار میں ان کی حیثیت اُردو غزل میں ہمیشہ مسلم رہی۔ان کے نزدیک زندگانی کی اصلیت ''عشق'' میں مقید ہے۔لہٰذا جب جذبے کی وارفتگی اور ادب کا عنصر باہم مختلط ہوجاتے ہیں تو یہ محض ایک تہذیبی رویہ نہیں رہتا بلکہ بےلوث اور پُرخلوص مسلسل اضطرابی عمل اور ایک طرح کی سلیقہ مندی کا اظہار بن جاتا ہےجس میں ادراکِ خودی، آدابِ خود آگاہی، ادراکِ ذات اور کشفِ ذات و معرفت ذات اور خود آگہی کی آرزو موجود ہے۔بقول ڈاکٹر سعد اللہ کلیم:

''اُردو غزل میں میرؔ کے بعد غالبؔ خود آگہی کی اس صلیب تک پہنچا اور غالبؔ کے بعد اقبالؔ کے حوالے سے جدید غزل کا یہ پسندیدہ موضوع بن گیا۔میرؔ کی غزل میں ادراکِ ذات کی شناخت گویا اُردو غزل کی آئندہ فکری جہت کی پہچان ہے۔'' (۲۴)

عاشق رضائے محبوب کو اپنی زندگی پر تقدم بخشتا ہے عشق میں یہ مقامِ افضلیت عاشق کو اور منتہائے مقصود تک لے جاتا ہے جہاں اس کا محبت کی سرشاری میں گذرا ایک ایک لمحہ عبادت کی صورت اختیار لیتا ہے۔

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا (۲۵)

تربت سے ہماری نہ اُٹھی گرد بھی اے میرؔ جی سے گئے لیکن نہ کیا ترک ادب ہم (۲۶)

دورِ ادب سے تم کھڑے میں پاکشیدہ ہوں مت آئیو جنازے کی میرے نماز کو (۲۷)

میر کے یہاں پاسِ ادب کا یہ تصور خالصتاً اسلامی تہذیب و مذہب سے استفادے پر مبنی ہے۔ان کا محبوب دنیا کا کوئی معمولی انسان نہیں ہے بلکہ وہ جس کے لیے کائنات تخلیق ہوئی۔

میر تقی میر کی غزلیات میں جو فنا کا تصور اُبھرتا ہے اس سے تزکیہ نفس، ابدی حیات اور انسانی تشخص کی تکمیل ہوتی ہے۔فنا فی اللہ، تزکیہ نفس اور اندرونی خواہشات کا قلع قمع کرنا درحقیقت بندے اور خدا کے درمیان رشتۂ الفت کو مضبوط کرنے کا ایک باسلیقہ اور باشعور تربیتی خزینہ قرار دیا جاسکتا ہے۔جب انسان پر یہ رازِ حیات منکشف ہوجاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں یہ دنیا بتوں کا گھر اور بےثبات ہے تو وہ اپنے اصل کی جانب رجوع کرتا ہے بصورتِ دیگر وہ لادینیت اور ریاکاری کا مرتکب ہوکر گناہوں کی گہری کھائی میں گر جاتا ہے۔

میر کے دین و مذہب کی کیا پوچھو ہو کہ ان نے تو قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا (۲۸)

موجیں کرے ہے بحرِ جہاں میں ابھی تو تُو جانے گا بعدِ مرگ کہ عالم حباب تھا(۲۹)

یہاں میر تقی میرؔ نے اسلامی تہذیب و مذہب کی بعض مذہبی علامات کے ذریعے انسانی زندگی کا اخروی زمانہ اس کی کائنات میں وقعت، گناہوں کا ارتکاب، اللہ تعالیٰ سے دوری اور تاخیر کی صورت میں رجوع کرنے کو اپنے تنقیدی شعور کا حصہ بنایا۔

اسلامی تہذیب و مذہب سے ماخوذ بعض مقدم کردار شیخ، زاہد، عابد، ملا، قاضی، مولوی، واعظ اور خطیب کو اسلامی تہذیبی پس منظر میں اُجاگر کر کے مشترکہ ہند اسلامی تہذیب کی رو سے ان کی منفعت اور ریاکاری کا بھانڈہ پھوڑتے نظر آتے ہیں۔ اُردو غزل کی مجموعی روایت میں شیخ ایک مضحکہ خیز کردار کے طور پر سامنے آتا ہے جس کے ظاہر و باطن میں تضاد ہے۔ یہ اسلامی تہذیب میں اپنے تقدس وارفعیت کے باوجود اس کی معنویت کو وسوسوں اور دنیاوی لالچ کا شکار بتایا گیا ہے۔ گویہ مذکورہ کردار اسلامی تہذیب میں اپنا خاص وقار، پہچان اور مرتبہ رکھتے ہیں مگر ان کی منفعت اسلامی تہذیب کے منافی ہے وہ جذبہ حب الوطنی، ایمان، اخلاص، ایثار اور محبت سے خالی ہوتے ہیں۔ میر تقی میر کے ہاں وحدت الوجود کا نظریہ بڑی خوبصورتی سے بیان ہوا ہے:

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نُور تھا خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ظہور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دُور تھا(۳۰)

دعا اسلامی تہذیب و معاشرت میں بڑی اہمیت اور صداقت کی امین ہے۔ تقدیر کو بدلنے میں یہ کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ دعا محض چند مودبانہ الفاظ ہی نہیں بلکہ انسان اور خدا کے درمیان رشتہ محبت استوار کرنے کا بہترین سلیقہ و ذریعہ ہے۔ میر کے یہاں یہ جذباتی وفکری وحدت صدق وصفائے دل اور اعتقاداتِ انسانی کا عاجزانہ رنگ بڑے منفرد انداز میں آیا ہے۔

میر کا متصوفانہ مزاج متعین کرنے میں ان کے گھریلو ماحول اور والدین کی تربیت کا بڑا ہاتھ تھا۔ بالخصوص ان کے والد محترم جو ایک باعمل صوفی اور عالم استغراق میں غرق رہنے والے متصوف شخص تھے اور ان کے منہ بولے چچا میر امان نے ان کے اندر احترامِ آدمیت خلقِ خدا سے ہمدردی اور رضائے خداوندی کے بنیادی شعور اور اہمیت کو اُجاگر کیا۔ ان کے اس گھریلو متصوفانہ ماحول سے یہ اخلاقیانہ سوچ ان کے ہاں راسخ ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہیکہ ابتدا ہی سے اپنے درویشانہ مزاج کی بدولت ان میں صبر و قناعت کا مادہ پیدا ہوگیا اور یہ سب فقرا اور اہل بصیرت لوگوں کی صحبت کا اثر تھا ان کے کلام میں دردمندی کا جذبہ اور سوز وساز کا پیدا ہونا بھی اسی امر کا ثبوت ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ:

> ''میر صاحب کی تربیت بھی سید امان اللہ شاہ کے زیر نظر ہوئی جو ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ زمانۂ طفولیت ہی سے شان درویشی اور صبر وقناعت پیدا ہوگئی تھی۔ سید صاحب کی بدولت میر صاحب کو بہت سے درویشوں اور اہل دل سے ملنے کا اتفاق ہوا اور ان کی سوز و گداز بھری باتیں سننے کا موقع ملا جو ان کے دل میں اُتر گئیں اور جن کا انس ان کی طبیعت اور کلام میں ہمیشہ باقی رہا۔''(۳۱)

میر تقی میر نے اپنی خاندانی میراث کو داغ دار نہیں ہونے دیا اور نہ ہی کہیں وہ فکری تنزلی کا شکار ہوئے۔ ان کے ہاں ایک طرح کا احساسِ تفاخر ملتا ہے جس میں بھی بہر طور عاجزی وانکساری پائی جاتی ہے۔ ان کی غزل میں وہ متصوفانہ روح کا فرما دکھائی نہیں دیتی ہے جو ولی، سراج دکنی، میر درد، شاہ نیاز بریلوی کے کلام کی خاصیت ہے مگر درویشانہ مزاج اور متصوفانہ طرزِ فکر کی

بنا پر ان کے ہاں عشق و معرفت، عالم محویت، محبوب کی تجلیات، دل کو کعبہ پر ترجیح دینا، حسن و عشق میں جسمانی لمس کے بجائے روحانیت کو آشکار کرنا۔ خدائے لایزال کے عشق میں مستغرق ہونا یہ تمام صفات انھیں پابند صوم وصلوٰۃ صوفی نہ سہی البتہ مزاجاً صوفی شاعر ضرور ثابت کرتی ہیں۔

تھا وہ رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ　　　سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا(۳۲)

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی　　　کوسوں اس کی اور گئے، پر سجدہ ہر ہر گام کیا(۳۳)

میر تقی میر محاکات نگاری کے ماہر ہیں ان کے اشعار میں اپنے عہد کی سماجی و مذہبی اور تہذیبی تاریخ کی چلتی پھرتی تصویریں نشانِ عبرت کی صورت میں جلوہ گر ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ جب سماج میں قدرِ انسانیت نہ رہے، مادیت پرستی، خود فراموشی اور بے حسی اسے اپنے حصار میں مقید کر لے تو انتشار اور منافقانہ رویے اسے کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ انسان کئی نفسیاتی اور سماجی بیماریوں کا شکار ہو کر مایوس رہنے لگتا ہے اس وقت ایک طاقت اسے تقدس اور روحانی فرحت عطا کرتی ہے اور وہ ہے مذہب جس میں رسمی تصوف نے اپنے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ گوپی چند نارنگ اس عہد کی بے حسی کا نقشہ اس طرح سے کھینچا ہے کہ:

> ''میرے زمانے میں ایک پوری تہذیب کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ شجاعانہ قوتیں فنا ہو گئی تھیں اور زندگی کی تھکی ماندی قوتوں کے پاس لے دے کر صرف مذہب کا سہارا رہ گیا تھا اور مذہب اس زمانے میں نام تھا رسمی تصوف کا۔''(۳۴)

لہٰذا میر بھی اس رسمی تصوف کا حصہ بنے اور اپنے کلام میں جا بجا اس کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

سعد اللہ کلیم نے میر کو عقیدے کے اعتبار سے متصوف ذوق کا حامل قرار دیا ہے کہ وہ تصوف کے قائل تھے۔ اہلِ بیت رسول ﷺ اور شہدائے کربلا سے انھیں بے حد محبت اور عقیدت تھی جس کا ثبوت ان کی خود نوشت سوانح عمری کے علاوہ ان کی غزل، قصائد میں بھی ملتا ہے۔ ان کے ہاں فقر و درویشی اور قلندرانہ طرزِ فکر درحقیقت انھیں اپنے عہد کے ماحول و معاشرت سے کم مگر خاندانی تہذیبی میراث سے ضرور ملا۔ وہ خانوادۂ سلوک و معرفت کے چشم و چراغ تھے اس لیے انھوں نے درد کی بھٹی میں خود کو تپا کر کندن بنا لیا۔

میر تقی میر نے زمانے کے تلخ حقائق، زندگی کے ناگفتہ بہ حالات، سماجی مسائل، دکھوں، درد و غم، نشیب و فراز، مایوسی، اپنی محرومیوں کو حزن و ملال اور رنج و الم کا پیرہن عطا کر کے اپنی اُردو غزل کو معنی خیز بنایا ہے عصمت درانی نے اپنے مضمون ''میر کی فارسی غزل میں حزنیت'' میں حزن و ملال اور رنج و الم کو میر کی شاعری کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت قرار دیا ہیں۔(۳۵) عبدالباری آسی نے بھی اس امر کا اظہار کیا ہے کہ حزن و الم اور دردمندانہ خیالات ان کے رنگ تغزل کے ساتھ مخصوص ہیں۔(۳۶)

ان کے فارسی و اُردو دواوین میں حزن و ملال اور رنج و الم کا رنگ جگہ جگہ چھایا ہوا نظر آتا ہے جس میں محرومیِ ذات اور ارمانوں کی دہلیز پر سرنگوں ہوتی آہیں ان کے دل گرفتہ احساسات کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ وہ کہیں کہیں محبوب کے سامنے اپنی ذات کی نفی کر دیتے ہیں۔ یہ عجز و انکسار محض جذباتیت اور بے بسی کی بنا پر ان کے کلام کا حصہ نہیں بلکہ عشق کی معنویت ان کی ذات پر عیاں ہونے کے بعد ہوا ہے۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ　　　کتنے آنسو پلک تک آئے تھے(۳۷)

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے　　　اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے (۳۸)

میر تقی میر کی شاعری اُردو ادب میں ایک جامعہ، ایک حرم اور ایک زر کثیر جزیرے کی حیثیت رکھتی ہے۔

کلام میر میں مشرقی تہذیب کے روبہ زوال ہونے کی داستان الم ناک سیل بے پناہ بن کر سرگرداں رہتی ہے جس کی حزنیہ لہریں روبرو چلتے غم و اندوہ کے صحرا کو بھی اپنے اندر سمیٹنے کی طاقت رکھتی ہے۔

اپنے عہد کی دگرگوں صورت حال، نوابین ریاست کی ناعاقبت اندیشی، زوال آمادہ تہذیبی رویے، اندرونی خلفشار، سامراجی قوتوں کے خلاف ردعمل کا شعور، غلامانہ ذہنیت پر تشویش کا اظہار اور انھیں راہِ راست پر لانے کے لیے میر کا رویہ احتجاج کی صورت میں ملتا ہے:

''میر کے کلام میں مقامی حکمرانوں کی زوال آمادہ روش، باہمی انتشار، استعمار نواز پالیسیوں پر تشویش، احساسِ غلامی کا کرب اور اس سے نجات کی حکمت عملی جیسے اہم موضوعات بڑے مؤثر پیرائے میں بیان ہوئے ہیں۔'' (۳۹)

سوز و گداز میر کی شاعری کا خاص رنگ اور نشتر ہے جس کے ذریعے وہ اپنے کلام میں تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ وہ تمام عمر سراپا غم بنے رہے۔ جذبۂ غم اور احساسِ شکست نے ان کے سینے میں دردمندی کے جذبے کو ہوا دی۔ انھوں نے عشق اور زندگی کے وسیع تر شعور کی بنا پر جمالیاتی وجدان کے صحرا میں قدم رکھا اور ساری زندگی سوز و گداز کی خاردار جھاڑیوں میں الجھے رہے۔

عبدالسلام ندوی کے خیال میں میر کی کوئی غزل سوز و گداز سے خالی نہیں ہوتی اور ان کے دیوان کے ہر صفحہ میں اس قسم کے اشعار نکل سکتے ہیں یہاں تک کہ بعض غزلیں اول سے آخر تک اسی رنگ میں شرابور ہیں۔ (۴۰)

اس رنگ کو ہم میر تقی میر کی شاعری کا فطری رجحان قرار دے سکتے ہیں۔ میر نے محبوب کا خیالی پیکر تراشا، اس کی کمال مہارت سے صورت گری کی، حالتِ جنوں میں دل کے مبہم تقاضے پورے کیے اور فکر و خیال کے سارے پہلوؤں کو دل کے کربلائے غم میں اُتار کر اپنے عہد کی روح کے کرب والم کو نہایت لطیف پیرائے میں اپنی شاعری کے شیشے میں اُتار دیا۔

حسرت وصل و غم ہجر و خیالِ رخِ دوست　　　مر گیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ (۴۱)

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے　　　دل نے صدمے بڑے اٹھائے تھے (۴۲)

یادِ ایام کہ یاں ترکِ شکیبائی تھا　　　ہر گلی شہر کی یاں کوچۂ رسوائی تھا (۴۳)

میر نے اپنے عہد کی اجتماعی تہذیبی روح کے کرب کو محسوس کیا۔ ان کی شاعری میں ہند اسلامی تہذیب کا المیہ اور سماج کا غم حقیقت و صداقت کا روپ لے کر سامنے آیا۔ وہ اس مرتی ہوئی تہذیب کے نمایندہ ہیں جس نے دو انتہاؤں کو صدیوں تک ایک دوسرے سے متصل رکھا۔ اب وہ رفتہ رفتہ روبہ زوال ہو رہی تھی۔ انھوں نے ایک خاص عہد کی اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز کو اپنے مزاج و سیرت کا حصہ بنا کر جذب و کیف سے المیاتی تاثیر پیدا کی جس کی تقلید ناممکن نظر آتی ہے:

''میر نے اپنے دور کی اجتماعی روح کے کرب کو اپنی تخلیقی روح میں جذب کر کے اس پہاڑ جیسے المیے کو اپنی شاعری کے آہنگ میں سمو دیا۔ اسی لیے میر کا غم محض روایتی چیز نہیں ہے اور نہ وہ فرار کی ایک صورت ہے بلکہ زندگی کی حقیقت و صداقت کا اظہار ہے۔'' (۴۴)

وہ رمز وایمائیت کے پردے میں، کہیں واضح طور پر اور کہیں علامتی پیرائے میں زندگی کی ان صداقتوں کو بیان کرتے ہیں۔ زمانے کا کرب ان کے رگ وپے میں سماتا چلا گیا اور وہ اسے حساس دل کی زینت بناتے گئے۔ دنیا کے سراپا زوال اور فانی ہونے کے عبرتناک مرقعے، تصوف کے اسرار ورموز، ہندستان کی سماجی زندگی کے مشاغل اُن کی شاعری کا حصہ ہیں:

شادی وغم جہاں کی ایک سے دس کا ہے فرق عید کے دن ہنسیے تو دس دن محرم رویے(۴۵)

میر کی شاعرانہ عظمت ان کے غمِ ذات سے نہیں غمِ کائنات، تہذیبی فکر، جذبے، احساس، غم ونشاط کی متضاد کیفیات اور تہذیبی وتاریخی شعور سے متعین ہوتی ہے۔ ان کے ہاں درد وغم محض غم نہیں بلکہ اس تہذیبی دیوار کی خستہ حالت کا نشاں ہے جسے انھوں نے ساری زندگی اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اس کی خستگی پر وہ اشک بار رہے اور دوسروں کو بھی بے قرار رکھا۔ میر کے لیے غم ونشاط لازمۂ حیات ہے۔ وہ اپنے عہد کی المناک تہذیبی وتاریخی صورتِ حال کو چشمِ بینا سے دیکھتے ہیں:

> ''میر کے عہد کی تہذیبی روح زخموں سے چور تھی۔ طالع آزماؤں کے ہاتھوں عروس البلاد دہلی کا بار بار اجڑنا ایسا المیہ تھا جس کا کرب میر کی تخلیقی روح میں سما گیا تھا۔ میر نے اپنے عہد کی تاریخ واقعیت کو شاعرانہ کیفیت میں ڈھال کر پیش کیا۔ اس طرح انھوں نے اپنا تزکیہ ہی نہیں کیا بلکہ غم ونشاط کی امتزاجی صورت کو پیدا کیا۔ میر نے اپنے عہد کے المیہ کو اجتماعی شعور کا حصہ بنا کر غم ونشاط کو زندگی کے لازمہ کے طور پر پیش کیا ہے۔''(۴۶)

یہی وجہ ہے میر کی شاعری میں سیاسی، اقتصادی، سماجی، تاریخی اور تہذیبی اقدار کی پامالی کا بیان ان کے لطیف لب و لہجے اور تہذیبی مزاج کے ساتھ ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری(۴۷)

میر تقی میر اُردو میں عشقیہ شاعری کے مردِ میداں ہیں۔ انھوں نے عشق کی کثافت اور لطافت کے فطری امتزاج سے اس میں مقامیت اور آفاقیت کا روپ بھر دیا۔ وہ اس طرزِ فکر کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ اگرچہ کئی شعرا نے ان کے اس عشقیہ رنگ میں خود کو رنگنے کی جسارت کی مگر وہ زیادہ قدم ان کے ساتھ نہ چل سکے۔ زندگی اور کائنات کے فطری رنگوں سے سجا یہ گلشن میر کی وارداتِ قلبی اور خارجی احساسات کا امین ہے جس میں عشق کے تمام رنگ شامل ہیں۔ لہٰذا کیفیات حُسن وعشق کا بیان ہو یا وارداتِ محبت حقیقی ومجازی وہ نہایت لطافت اور شائستگی سے فارسی تراکیب اور دل نشیں تلمیحات کے ذریعے اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی عشق کو ان کی شاعری کی تخلیقی روح قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عشق ان کی شاعری کی تخلیقی روح ہے اور اسی سے ان کی سیرت وشخصیت تعمیر ہوئی ہے۔ میر کی شاعری اس لیے عشقیہ شاعری ہے جس میں مقامیت بھی ہے اور آفاقیت بھی۔ ایسی شاعری اس سے پہلے نہ اُردو میں ہوئی اور نہ میر کے بعد آنے والے شعرا پر گہرے اثرات کے باوجود اس عشقیہ رنگ کی کوئی پیروی نہ کرسکا۔ یہ عشق کثافت بھی ہے اور لطافت بھی اور ان دونوں کے ملنے سے میر کی شاعری کا رنگ وآہنگ پیدا ہوا ہے۔''(۴۸)

میر کی زبان عشق اور زندگی کے وسیع تر امکانات کے احساس کو اُجاگر کرتی ہے۔ انھوں نے سودا، ناسخ، غالب اور اقبال کی طرح جلالی اور سرکشیدہ زبان کے استعمال سے گریز کیا۔ وہ اپنے بہتر تخلیقی شعور اور فکری وفنی ریاضت سے سجل، کومل،

لطیف اور مفرد الفاظ کی پیوندکاری سے تراکیب ومحاورات تراش کر اپنے کلام کو پختہ اور سبق آموز بناتے ہیں۔ان کی یہ موسیقی آمیز زبان ان کی شاعری کو تاثیر اور تازگی عطا کرتی ہے۔ڈاکٹر انور سدید کا کہنا ہے:

''میر نے سرکشیدہ اور جلالی زبان استعمال کے بجائے سجل، کومل، لطیف اور موسیقی آمیز زبان پیدا کی اور مفرد الفاظ کے پیوند سے تراکیب تراشیں جن سے میر کا شعر جگمگانے لگتا ہے۔''(۴۹)

اس میں زندگی کی قوت بھی ہے اور شکست خوردگی کا عکس بھی۔انھوں نے زندگی کے غموں اور دکھوں سے منہ نہیں موڑا بلکہ اپنے داخلی سوز وگداز میں سمو کر اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔یہ حوصلہ مندی ان کے کلام میں جگہ جگہ محسوس کی جاسکتی ہے۔

گلی میں اُس کی پھٹے کپڑوں پر مرے مت جا　　لباسِ فقر ہے واں ، فخر بادشاہوں کا(۵۰)

دراصل ان کے ذاتی غم اور زمانے کے غموں نے ان کے کلام میں نشتریت اور حساسیت پیدا کی۔وہ جس تہذیبی وسماجی نظام کے فرد تھے اس کے مصائب وآلام نے انھیں قریہ قریہ مضطرب و بے قرار رکھا۔وہ دریا دریا روئے، اجڑے نگر کا ماتم کیا، ان کا دل چراغِ مفلس بنا، زندگی سے ملی ویرانیوں نے ان کا جینا محال رکھا مگر استقامت اور صبر ان کی زندگی کا خاص جزو ہے انھوں نے بڑی جواں مردی سے ان حالات کا مقابلہ بھی کیا۔مصائب اٹھائے، دکھ جھیلے اور اس غم وافسردگی کو اپنے تخلیقی شعور کا حصہ بنایا۔

نامرادانہ زیست کرتا تھا　　میر کا طور یاد ہے ہم کو(۵۱)

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے　　دل ہوا ہے چراغ مفلس کا(۵۲)

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا　　ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو(۵۳)

عالم عالم عشق وجنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے　　دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے(۵۴)

میر تقی میر کی شاعری انسانی زندگی کے سچے جذبوں اور تہذیبی رویوں کی روداد معلوم ہوتی ہے۔وہ بے ساختہ انداز میں اپنے دلِ دردمند اور سماجی کرب کو احساس اور جذبے کی سلگتی دھوپ میں چھوڑ کر عشق کی آگ میں جلتے رہے۔وہ عمر بھر سوختہ جاں رہے۔عشق کی آگ نے انھیں ہر دم بے چین کیے رکھا۔انھوں نے نیم مجذوبی حالت میں دل کے کومل جذبوں، زمانے کے سچے اور دردانگیز مرقعے پیش کیے:

''میر کی شاعری ان کی سوختہ جانی کی تفسیر ہے۔ان کے دل میں ایک آگ ہے اور ان کی شاعری اسی آگ کی شعلہ فشانی ہے۔''(۵۵)

درد و مایوسی ان کے کلام کا خاصہ ہے۔وہ سماج وتہذیب کے تھپیڑوں اور اس کے داخلی معاملات کو نہایت خودداری اور عالی ظرفی سے جذب وکیف کے رنگ میں پیش کرنے کے ماہر ہیں۔دہلی کے تہذیبی نقوش اور زمانے کی بے وفائیاں و کج ادائیاں ان کے تخلیقی مزاج میں ڈھل کر ایک خاص لہجہ وآہنگ اختیار کر لیتی ہیں۔

میر تقی میر کی شاعری عشق وتصوف، مصائبِ پیہم، اخلاق ومروت اور ان کی ذاتی زندگی کی شدت آفرینیوں کی صحیح ترین عکاس ہے۔اس کا اصلی جوہر سوز وگداز اور قلبِ حزیں کے زخموں کی لاکاری ہے۔وہ زندگی کے یاس وحرماں سے دیدہ ودل کو آغوش جمال کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں نہایت فہم وفراست اور درد وسوز سے خارجی حیات کی ہنگامہ خیزیاں، جسم

و جمال کی لطافتوں، افلاس و بے کاری سماج، دل کی گلابی اور تہذیبی و سماجی رویوں کا احاطہ کیا ہے۔ میر زندگی سے فرار کا شاعر نہیں بلکہ زندگی آمیز حسرتوں کا امین ہے جس نے سلاست وفصاحت، سوز و گداز اور درد و سوز جیسے حربوں کے ذریعے اپنی غزل گوئی کو رعنائی بخشی۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہے:

> ''غزل گوئی میر صاحب کی تیغ کمال کا اصل جوہر ہے۔ ان کی غزلیں سوز و گداز اور درد کی تصویریں ہیں جنھیں بیان کی تاثیر نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ ان کا منتخب کلام سلاست و فصاحت کا ایک ایسا مرقع ہے جس کی آب و تاب کبھی ماند ہوتی نظر نہیں آتی، اور انھی محاسن نے میر صاحب کو 'خدائے سخن' بنایا ہے۔''(۵۶)

میر کی شاعری میں زیرِلب دردمندی اور دردانگیزی کی چبھن محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کی شائستہ زبان تہذیبی قدروں کی آئینہ دار ہے جس نے ان کی داخلی روح اور زمانے کی اجتماعی روح کی آبیاری کی۔ انھیں اپنوں کی بے رخی، زندگی کی تنگ دستی، دل و دلی کی بربادی، اپنی حرماں نصیبی اور عشق کی تائیدی صورتِ حال نے غم والم کا مجسمہ بنا دیا تھا اس لیے ان کی زیست میں غم و اندوہ کے پہاڑ ٹوٹ کر گرتے رہے اور وہ غم کی مجسم تصویر بنے رہے۔ کلیم الدین احمد میر کی اس دردمندی اور حرماں نصیبی کا نقشہ اس طرح سے کھینچتے ہیں:

> ''بات یہ ہے کہ میر ازل سے دردمند دل لے کر آئے تھے۔ عشق کی کاوشوں نے اس دردمندی میں اضافہ کیا۔ ان کی افتادِ زندگی نے عشق کی تائید کی۔ انھیں چاروں طرف اپنی ذاتی حرماں نصیبی کا نقشہ نظر آیا۔ ماحول نے اس طرزِ خیال کی مزید تائید کی۔ یہی سبب ہے کہ میر کی دنیا اتنی تاریک ہے۔ کہیں اُمید کا ستارا چمکتا ہوا نہیں دکھائی دیتا۔ ان کی زندگی درد سے معمور تھی اپنوں کی بے رخی، تنگ دستی وعسرت، پھر دلی کی بربادی، عام بربادی وانقلاب نے ان کے حساس دل کو غم والم کا مرقع بنا دیا تھا۔''(۵۷)

میر کی غزلیات کے علاوہ مثنویات اور ذکرِ میر میں عشق مجاز سے حقیقت کی جانب متحرک ہو کر اپنی نشانِ منزل تک پہنچنے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں یہ صدق وصفا اور پُرخلوص جذبہ ہے۔ وہ عشق کی ماہیت اور صفات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اس میں جسمانی اتصال کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ روحانی تقدس بھی پیش نظر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز سے حقیقت کی جانب بڑھنے کا یہ رجحان ان کی غزل میں معنی خیز معلوم ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سعد اللہ کلیم: ''عشق کی فکری اساس جوان کی غزل سے اُبھرتی ہے اس نے بھی ہجر و فراق کے حوالے سے جسمانی اتصال کی حدت کو کم کر کے اس کے اندر ایک طرح کی روحانی لطافت کو شامل کر دیا ہے۔ عام طور سے میر کی غزل مجاز کو لے کر حقیقت کی طرف بڑھتی محسوس ہوتی ہے۔''(۵۸)

یہاں ہم ایسے اشعار درج کرتے ہیں جن میں اسلامی تہذیبی پس منظر نمایاں ہوتا دکھائی دیتا ہے:

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا　　　سرمایۂ توکل یاں نام ہے خدا کا(۵۹)

ارض و سما میں عشق ہے ساری چاروں اور بھرا ہے عشق　　　ہم ہیں جناب عشق کے بندے نزدیک اپنے خدا ہے عشق
ظاہر و باطن اوّل و آخر پائیں بالا عشق ہے سب　　　نور و ظلمت معنی و صورت سب کچھ آپ ہی ہوا ہے عشق(۶۰)

اسلامی تہذیبی پس منظر کی روشنی میں کائنات کی بے ثباتی کا مضمون بھی اُردو غزل کی عمومی روایت کی شکل میں ہر عہد کے شعرا کے یہاں موجود رہا ہے میر بھی اسی رجحان کے پاسدار ہیں۔ڈاکٹر سعداللہ کلیم کے خیال میں میر کی غزل بھی اسی روایت کی پیروی کرتی ہے۔(۶۱) یہ خالصتاً قرآنی طرزِ فکر ہے ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ اس دنیا کو کسی صورت قرار میسر نہیں ہے یہ فنا ہونے والی ہے اور بقا صرف اللہ کی ذاتِ اقدس کو حاصل ہے۔

''حیات بعد الموت'' عقاید اسلام میں سب سے اہم عقیدہ ہے۔ڈاکٹر سعداللہ کلیم نے اسے اسلامی عقاید کا بنیادی عقیدہ قرار دیا ہے۔(۶۲) اسلامی معاشرت کی فکریات میں انسان کے وصال کے بعد (قَالُوٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ) قیامت کے دن اسے دوبارہ زندہ کر کے اس کا حساب کتاب ہوگا اور جزا و سزا کا عمل ہوگا جس کے بعد عدم کی زندگی ہے۔کلامِ میر میں اسلامی تہذیب و مذہب کا یہی فکری پس منظر ہے۔جس کی بنا پر ان کے کلام میں فقر، استغنا، ایثار، قربانی اور تواضع جیسی صفات روشنی بکھیرتی ہیں۔

میر اسلامی تہذیب و مذہب کے عقیدۂ آخرت کے قائل ہیں۔میؔر نے اپنے مذہبی عقاید اور تہذیبی شعور کی بنا پر جا بجا اپنے تمام دواوین میں انسان کی کم وقعتی، جاہ و حشمت، شان و شوکت، دولت و ثروت، حسن و زندگانی اور شہنشاہی سب فنا پذیر ہیں اور فنا پذیری کو اپنے کئی اشعار کی زینت بنایا ہے۔لہٰذا اپنے سماجی شعور، سوز و گداز، سادگی و پرکاری، دردمندی، خلوص و صداقت، اجمال و ایمائیت، سہلِ ممتنع اور خطابیہ انداز جیسی بے مثل خصوصیاتِ کلام رکھنے والے میؔر جب اپنی وارداتِ قلبی کی سچی ترجمانی اور زندگی کی اصل صداقتوں کو شعر کے پیرائے میں ڈھالتے ہیں تو یہ درحقیقت صرف ایک فرد کی زندگانی کا نوحہ نہیں رہتا بلکہ اسلامیانِ ہند کے شاندار ماضی اور مغلیہ عہد کی صحیح تفسیر معلوم ہوتی ہے۔

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے پھیلا تھا اس کا کاہے کو یاں خرابا(۶۳)

ثبات قصر و در و بام و خشت و گل کتنا عمارتِ دل درویش کی رکھو بنیاد(۶۴)

میر تقی میر کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں عہد میر کی تمام تر زبوں حالی، سیاسی ناہمواری، اکھاڑ پچھاڑ، سماجی انتشار، اندرونی خلفشار، فرقہ وارانہ مناقشات اور معاشی و تہذیبی بدحالی کو دیکھا جا سکتا ہے۔میر تقی میر ان تاریخی حقائق و سانحات کے چشم دید گواہ تھے۔نادر شاہ ۱۷۳۹ء، احمد شاہ ابدالی ۱۷۴۸ء-۱۷۵۱ء مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ پانی پت (۱۷۶۱ء) جس میں افغان اور مغل بھی شامل تھے۔راجپوتوں کی سرتوڑ کوششیں شاہ عالم ثانی کی آنکھوں میں سلائیاں پھیرنے کا واقعہ، مغلیہ سلطنت کا سورج آہستہ آہستہ غروب ہونا، یہ سب تاریخی واقعات کسی نہ کسی شکل میں ان کے کلام کی زینت بنتے ہیں۔ان کی باریک بین نگاہیں ماضی، حال اور مستقبل تینوں پر یکساں مرکوز ہیں۔وہ ایک دانش ور کی طرح نہ صرف اپنے عہدِ رفتہ کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہیں بلکہ مستقبل کے لیے بھی مناسب لائحۂ عمل اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کی اس ارتکازی صفت کی جانب انور سدید ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں: ''میر کی غزل نے انسانی تجربے کو ارتکازی صورت دی ہے اور اس میں ماضی اور حال کے علاوہ مستقبل کی آواز بھی مجسم ہو گئی ہے۔'' (۶۵)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا(۶۶)

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا(۶۷)

اے حب جاہ والو! جو آج تاجور ہے　　کل اس کو دیکھو تم نہ تاج ہے نہ سر ہے(۶۸)

میر حقیقتِ الٰہیہ کا ادراک اسلام کے بعض مستند تاریخی حوالہ جات اور تہذیبی رویوں کے توسط سے کرتے ہیں۔ وہ حضرت خضرؑ، عیسیٰؑ، موسیٰؑ، محمدﷺ، سلیمانؑ، ابراہیمؑ کو تلمیحی اشاروں کے ذریعے سے موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ خضرؑ و موسیٰؑ جن کا ذکر سورہ الکہف میں ہے، ہندستانی روایت میں حضرت خضرؑ ندیوں کے راجہ اور پانیوں کے بادشاہ ہیں مگر قرآن اس ضمن میں خاموش ہے آپ کو ایک اصلاحی اور رہنما کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ مجاز کی سطح سے اُٹھ کر حقیقت کے اصلی مقام عشق کو پا لینے کے خواہش مند ہیں خود کو فنا کر کے اور اپنی آرزوؤں کا گلا گھونٹ کر وہ امر ہو جانا چاہتے ہیں تاکہ ان کی آخرت کی زندگی جو قیامت کے بعد ہمیشہ کے لیے ہوگی سرخرو ہو جائے۔

باہر نہ آتا چاہ سے یوسف جو جانتا　　لے کارواں مرے تئیں بازار جائے گا(۶۹)

یہ تو ہم کا کارخانہ ہے　　یاں وہی ہے جو اعتبار کیا(۷۰)

سچ تو یہ ہے کہ میر نے اُردو شاعری کے گل فشاں چمن کو اپنے خونِ جگر سے سینچا، انھیں معتبر معمارانِ اُردو کی صفِ اول میں شمولیت کا اعزاز ملا۔ ان کی غزلیات سوز و گداز اور درد و الم کی آئینہ دار ہیں۔ شعرائے اُردو غزل ہمیشہ آپ کے درسِ سخن سے فیض یاب ہوتے رہے۔ یہ اعزاز اُردو غزل میں کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔

حوالہ جات

۱۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اُردو، مترجم: مرزا محمد عسکری، لاہور: علمی بک ہاؤس، ۱۹۴۸ء، ص: ۰۷
۲۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت سوم، اپریل ۲۰۱۱ء، ص: ۵۳۳
۳۔ ایضاً، ص: ۹۸
۴۔ ایضاً، ص: ۱۱۷
۵۔ ایضاً، ص: ۱۲۴
۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، جلد دوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، طباعت ہفتم، جولائی ۲۰۱۳ء، ص: ۳۹۵
۷۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت سوم، اپریل ۲۰۱۱ء، ص: ۱۱۴
۸۔ میر محمد تقی میر، کلیاتِ میر، دیوان سوم، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص: ۳۸۱
۹۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت سوم، اپریل ۲۰۱۱ء، ص: ۱۲۹
۱۰۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، دیوان اول، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص: ۲
۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۸۳
۱۲۔ ایضاً، دیوان سوم، ص: ۳۷۹
۱۳۔ ایضاً، ص: ۴۳۸
۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، جلد دوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، طباعت ہفتم، جولائی ۲۰۱۳ء، ص: ۴۰۹
۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، طبع سوم، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۵۳

۱۶۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، دیوان اول، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۱۱۶
۱۷۔ ایضاً،ص:۱۸۲
۱۸۔ نقوش، سہ ماہی، میر تقی میر نمبر، (مدیر: محمد طفیل)، شمارہ ۱۲۵، لاہور: ادارہ فروغ اُردو، اکتوبر ۱۹۸۰ء، ص:۴۸۴
۱۹۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، دیوان دوم، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۳۸۰
۲۰۔ ایضاً،ص:۴۰۲
۲۱۔ ایضاً،ص:۴۵۰
۲۲۔ ایضاً،ص:۲۷۹
۲۳۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، اُردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ۲۰۰۲ء، ص:۱۶۶
۲۴۔ سعداللہ کلیم، ڈاکٹر، اُردو غزل کی تہذیبی وفکری بنیادیں، جلد اول، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص:۳۵۸
۲۵۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، دیوان اول، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۳۱
۲۶۔ ایضاً، دیوان دوم، ص:۲۸۷
۲۷۔ ایضاً، دیوان سوم، ص:۴۲۶
۲۸۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، دیوان اول، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۴
۲۹۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت سوم، اپریل ۲۰۱۱ء، ص:۱۲۰
۳۰۔ ایضاً،ص:۲
۳۱۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اُردو، مترجم: مرزا محمد عسکری، لاہور: علمی بک ہاؤس، ۱۹۴۸ء، ص:۱۱۷
۳۲۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت سوم، اپریل ۲۰۱۱ء، ص:۹۸
۳۳۔ ایضاً،ص:۱۰۲
۳۴۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، اُردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ۲۰۰۲ء، ص:۱۶۱
۳۵۔ عصمت درانی، میر کی فارسی غزل میں حزنیت، مشمولہ: الزبیر، سہ ماہی، شمارہ نمبر۲، بہاول پور، ۲۰۰۹ء، ص:۴۳
۳۶۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، دیوان اول، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۴۲
۳۷۔ ایضاً،ص:۱۶۳
۳۸۔ ایضاً،ص:۱۶۶
۳۹۔ محمد رؤف، کلامِ میر — مابعد نوآبادیاتی مطالعہ، مشمولہ: تحقیقی زاویے، تحقیقی وتنقیدی مجلّہ، شمارہ ۵، بھمبر، جنوری تا جون ۲۰۱۵ء، ص:105
۴۰۔ عبدالسلام ندوی، شعرالہند، حصہ اول، اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۴۹ء، ص:۶۴
۴۱۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، دیوان اول، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۱۳۹
۴۲۔ ایضاً،ص:۱۶۳
۴۳۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت سوم، اپریل ۲۰۱۱ء، ص:۱۳۸
۴۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُرد، جلد دوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، طباعت ہفتم، جولائی ۲۰۱۳ء، ص:۴۱۳

۴۵۔ میر تقی میر،کلیاتِ، دیوان اول، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۱۶۴

۴۶۔ نجیب جمال، ڈاکٹر، میر کی شاعری میں اعلیٰ انسانی اقدار کی نمود، مشمولہ: تحقیقی زاویے، شمارہ۳، ھمبر، جنوری تا جون۲۰۱۴ء، ص:۱۴۷

۴۷۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، دیوان اول، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۱۵۰

۴۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، جلد دوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، طباعت ہفتم، جولائی۲۰۱۳ء، ص:۴۱۰

۴۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۳ء، ص:۲۰۶

۵۰۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت سوم، اپریل ۲۰۱۱ء، ص:۱۳۴

۵۱۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، دیوان اول، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۶

۵۲۔ ایضاً، ص:۱۲۲

۵۳۔ ایضاً، دیوان پنجم، ص:۵۹۲

۵۴۔ ایضاً، ص:۶۰۶

۵۵۔ کلیم الدین احمد، اُردو شاعری پر ایک نظر، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۷ء، ص:۹۳

۵۶۔ نقوش، سہ ماہی، میر تقی میر نمبر، (مدیر: محمد طفیل)، شمارہ ۱۲۵، لاہور: ادارہ فروغ اُردو، اکتوبر ۱۹۸۰ء، ص:۶

۵۷۔ کلیم الدین احمد، اُردو شاعری پر ایک نظر، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۷ء، ص:۹۰

۵۸۔ سعداللہ کلیم، ڈاکٹر، اُردو غزل کی تہذیبی وفکری بنیادیں، جلد اول، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص:۳۵۷

۵۹۔ میر تقی میر،کلیاتِ، دیوان چہارم، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۴۵۸

۶۰۔ ایضاً، دیوان پنجم، ص:۵۷۶

۶۱۔ سعداللہ کلیم، ڈاکٹر، اُردو غزل کی تہذیبی وفکری بنیادیں، جلد اول، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص:۳۶۶

۶۲۔ ایضاً، ص:۳۶۷۔۳۶۸

۶۳۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت سوم، اپریل ۲۰۱۱ء، ص:۱۴۴

۶۴۔ ایضاً، دیوان سوم، ص:۳۹۴

۶۵۔ ایضاً، ص:۱۵۳

۶۶۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، دیوان اول، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۶

۶۷۔ ایضاً، ص:۶

۶۸۔ میر تقی میر،کلیاتِ، دیوان اول، مرتبہ: عبدالباری آسی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۱۴۷

۶۹۔ میر تقی میر،کلیاتِ میر، جلد اول، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت سوم، اپریل ۲۰۱۱ء، ص:۱۲۴

۷۰۔ ایضاً، ص:۱۲۴

☆......☆......☆